© rasailojaraid.com

ڈاکٹر نذیر احمد، سابق چیئرمین اٹامک انرجی کمیشن۔ پاکستان

قرآن مجید کے متعلق ایک سائنس دان کا زاویۂ نگاہ

کچھ عرصہ ہوا ایک گفتگو کے دوران مجھ سے سوال کیا گیا کہ کیا میری سائنس کی تعلیم نے میرے مذہبی عقائد کی بنیادیں کمزور نہیں کردیں؟ اور کیا مجھے اس بات میں دقت محسوس نہیں ہوتی کہ میں سائنس کے جدید انکشافات اور مذہبی عقائد اور روایتی خیالات میں مطابقت پیدا کرسکوں؟ مثال کے طور پر مجھ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت آدم کی خلقت کے بارے میں جو بیان قرآن مجید میں ہے میں اس کا انطباق حیوانی ارتقا کے نظریے سے کیسے کرسکتا ہوں؟ اس ضمن میں مجھے یاد دلایا گیا کہ اس نظریے کی رُو سے زندگی مختلف شکلوں میں ظہورِ آدم سے کروڑوں سال پہلے زمین پر موجود تھی۔ لیکن اس کے برخلاف مذہبی خیالات رکھنے والوں کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت آدم اور دوسرے جانداروں کو تقریباً ایک ہی وقت میں پیدا کیا جس سے پہلے اس زمین پر زندگی کا وجود نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جن لوگوں نے مجھ سے یہ سوالات کیے تھے، ان کے دلوں میں ایک قسم کی دیانتدارانہ کشمکش ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس قسم کی دماغی الجھن صرف ان لوگوں تک محدود نہیں، بلکہ بہت سے ذہین اور سنجیدہ قسم کے لوگوں کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ جو سوالات ان لوگوں نے مجھ سے کیے وہ کافی دلکش اور قابلِ غور تھے اور میں نے پوری توجہ سے ان پر غور کرنا شروع کیا۔ جیسے جیسے میں نے ان امور کا تجزیہ کیا، جو ان سوالات کی تہ میں تھے، ویسے ویسے انھوں نے ایک صاف اور غیر مبہم شکل اختیار کرنا شروع کردی۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے خیالات ایک مضمون کی شکل میں مرتب کروں۔ تاکہ دوسرے لوگ بھی اس معاملے پر غور و فکر کرسکیں۔

جس ذہنی اُلجھن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، چونکہ اس کی ابتدا آیاتِ قرآنی کی تاویل سے ہوتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم صاف اور واضح طور پر اس بات کا فیصلہ کریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وحی الٰہی کی حقیقی غرض وغایت کیا ہے؟ اگر اس اصولی بات کا ہم پہلے فیصلہ نہ کریں تو یہ ممکن ہے کہ ہم اس مسافر کی طرح جو سمندر میں سفر کر رہا ہو یا تو تضاد کی ان چٹانوں سے ٹکرا جائیں جو سطح کے نیچے مخفی ہیں یا شک وشبہ کی اس کہر میں راہ گم کر دیں جو بالائے سطح ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو سائنس کے مختلف علوم مثلاً فلکیات، حیوانیات، کیمیا، طبیعیات وغیرہ کی تعلیم دی جائے تو ہم پر لازم ہوگا کہ ہم ان الفاظ اور آیات کے جن میں ان مضامین کی طرف اشارے ہیں، ظاہری اور لفظی معنی اختیار کریں۔ اس صورت میں قرآن مجید میں سائنس کے اسباق سب سے زیادہ اہم بن جاتے ہیں اور دوسرے پہلو یعنی اخلاقی قدروں اور اعمالِ صالح کی تعلیم ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مذکورہ بالا مفروضہ کے ماتحت اس نتیجہ سے فرار ممکن نہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے لیے قرآنی تعلیمات کو جدید سائنس کے انکشافات سے مطابقت دینا نہایت مشکل کام ہوگا۔ مگر میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ دورِ حاضر کے ذہین لوگوں میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا یہ خیال ہو کہ قرآن مجید کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو سائنس کے مختلف علوم سکھائے۔ گو اس خیال سے قرآن مجید کی ہمہ گیری کے عقیدے کو بجا طور سے تقویت ہوتی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے، ان میں سے اکثر کا خیال یہ ہے کہ وحی الٰہی کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار اور بہترین طرزِ معاش سکھائے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ عبادات بھی بتلائے جن سے یہ مقاصد پورے ہوں۔ اگر ہم وحی الٰہی کی غرض وغایت تسلیم کر لیں تو جن آیات میں قدرتی مناظر کا ذکر ہے ان کی ہمیں ایسی تاویل کرنا پڑے گی جو اس نظریے کے مطابق ہو اور اخلاقی اقدار کی تعلیم کو صفِ اوّل میں جگہ دینا پڑے گا۔ بالفاظِ دیگر بجائے اس کے کہ ان آیات کے جن میں قدرتی مناظر یا علم الاشیا کی طرف اشارے ہیں، ہم ظاہری یا لفظی معنی لیں۔ ہمیں حسبِ ضرورت اور سیاقِ عبارت سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بطورِ امثال تشبیہ یا استعارہ نازل کی گئی ہیں۔

خود قرآن مجید میں متعدد مقامات ایسے ہیں جو مذکورہ بالا نظریے کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں اور جن پر غور کرنے سے ان لوگوں کی ذہنی الجھن دور ہو سکتی ہے جو قرآن مجید کے الفاظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ظاہری اور لفظی معنی اختیار کرنے پر مُصِر ہوں۔ مثلاً لفظ "وجہ" پر غور کیجیے جس کا لفظی ترجمہ "چہرہ" ہے اور جس کی جمع "وجوہ" (چہرے) ہے آیت شریفہ:

"لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب" میں یہ لفظ اپنے لفظی اور ظاہری معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ "نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے (منہ) مشرق یا مغرب کی طرف کو لو" لیکن جب یہی لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے کہ:

"کل من علیہا فان، ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام" تو ہم یہاں "وجہ" کا ترجمہ "منہ یا چہرے" نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب ہر چیز فنا پذیر ہوجائے گی تو اللہ تعالیٰ کا صرف چہرہ رہ جائے گا۔ یہاں "وجہ" کا تمثیلی ترجمہ بمعنی "ذات" کرنا پڑے گا۔ یعنی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ "جب تمام اشیا فنا پذیر ہوں گی تو صرف باری تعالیٰ کی ذات رہ جائے گی" اسی طرح ہاتھ کے لیے عربی کا لفظ "ید" ہے۔ جس کی جمع "ایدی" ہے لیکن ایک ہی آیت میں یہ لفظ اپنے ظاہری اور تمثیلی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

"ید اللہ فوق ایدیکم" اس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا کہ "خدا کا ہاتھ تمھارے ہاتھوں کے اوپر ہے" لیکن ہر ذی فہم آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوگا تو اس کے معنی "طاقت یا رحمت" کے لینے چاہئیں۔

میں نے محولہ بالا پیراگراف میں صرف دو آیات پر اکتفا کیا ہے جن کا اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح اور کئی آیات ہیں جن کے معنی ہمیں تمثیلی لینے پڑتے ہیں۔ مثلاً جب حضرت ابراہیم نے اپنے مخالف سے کہا کہ:

"فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق" یعنی اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے مغرب کی طرف لاتا ہے" تو وہ فلکیات کا کوئی سبق نہیں دے رہے تھے جیسا کہ پہلے مفسرین نے فرض کرلیا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ از روئے قرآن زمین ساکن ہے اور سورج مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوکر اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ یہ تو بطلیموس کا خیال تھا جسے ہمارے مفسروں نے اپنی تفسیروں کا ایک جزو بنالیا۔ اس آیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے ایک روزمرّہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عینی مشاہدے سے کام لے کر اپنے مخالف پر انسان کی کمزوری کے مقابلے میں خدا تعالیٰ کی قوت کی مثال پیش کی کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کی قوت کا مقابلہ کر سکتا ہے تو "فات بها من المغرب" وہ سورج کو مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف لے جا کر دکھائے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ "اللہ جعل لکم الارض بساطاً" "خدا نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا" - تو یہ کوئی جغرافیہ کا سبق نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ زمین چپٹی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی انسانوں پر عنایات کی ایک مثال ہے کہ اس نے زمین سے ہم کو ایسے آرام کے اسباب بہم پہنچائے جن کی انسان اپنے مکان کے فرش سے توقع کر سکتا ہے۔ جب قرآن مجید نازل ہوا تو اس وقت عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ زمین چپٹی اور ساکن ہے اور سورج ہر روز مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہو کر اس کے گرد گھومتا ہے۔ قرآن مجید نے ان عام خیالات کی بنا پر ان سے اہم اخلاقی نتائج اخذ کیے۔ لیکن توجہ کا مرکز وہ اخلاقی نتائج ہیں جو اخذ کیے گئے ہیں نہ کہ مشاہدات فطرت، جن کی طرف اشارے کیے گئے اور جن کی حیثیت ثانوی ہے۔

قرآن مجید کی آیت: "یضرب اللہ لکم الامثال" میں صاف اور واضح اشارہ ہے کہ قرآن اکثر امثال کو اپنے معانی کے اظہار اور بیان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں اگر ان امثال کو ہم ان کے ظاہری اور لغوی معنوں میں لیں اور جو گہری حقیقتیں ان میں مضمر ہیں ان کو نظر انداز کر دیں تو یہ ہماری غلطی ہوگی۔ مثال کے طور پر جو لوگ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے ہیں اور خدا کے احکام سے پہلو تہی کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"قد مکر الذین من قبلهم فاتی اللہ بنیانهم من القواعد فخر علیهم السقف من فوقهم واتٰهم العذاب من حیث لا یشعرون"

اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یوں ہوگا کہ "ان لوگوں سے پہلے ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے چالاکی اور مکر سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بنیادیں ہلا دیں اور ان کی چھتیں ان پر گر پڑیں اور ان پر عذاب اس طرح آیا کہ وہ اسے سمجھ بھی نہ سکے۔"

اگر ہم اس آیت پر تھوڑا سا غور کریں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بنیان اور سقف کے لغوی معنی یعنی گھروں کی بنیادیں اور چھت لینے سے اس آیت کے معنی نہ صرف محدود ہو جاتے ہیں بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طریقے کی سزا یا عذاب عام طور پر اس دنیا میں دیکھنے میں نہیں آتی - البتہ اگر ہم ان الفاظ کے تمثیلی معنی اختیار کریں یعنی بنیان سے مراد وہ بنیادی لوازمات سمجھیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے اور سقف سے مراد وہ حفاظتی ذرائع تصور کریں جو انسانی زندگی کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں اور اس آیت کا مفہوم ان مطالب کی روشنی میں سمجھا جاتے تو یہ آیت ان واقعات کی نشاندہی کرتی ہے جو قوموں کی تاریخوں میں بار بار دیکھنے میں آتے ہیں - کیونکہ اس مفہوم کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ جن لوگوں نے خدا کے قوانین اور احکام سے سرکشی کی - ان کی ہستی کی بنیادیں ہلا دی گئیں - حتیٰ کہ وہ تمام اسباب جنھیں وہ اپنی حفاظت کے لیے کافی تصور کرتے تھے بے کار ثابت ہوئے اور ان کا زوال اور انجام ایسے طریقے سے ہوا، جیسے وہ اپنی مضبوط بنیادوں اور حفاظتی ذرائع کی بنا پر ممکن خیال نہیں کرتے تھے - اقوام عالم کے عروج و زوال پر صرف طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اس آیت کی عمیق اور وسیع سچائی ان معنوں میں جو ہم نے بیان کیے ہیں، ظاہر ہو جائے گی - خود ہمارے اپنے زمانے میں ہٹلر کی قیادت میں نازی جرمنی کا جو حشر ہوا وہ اس آیت کے وسیع مفہوم کی ایک عمدہ مثال ہے -

میں نے اوپر کے پیراگراف میں ایک آیت کا حوالہ دیا ہے - اگر لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے اس کی تمثیلی تاویل کی جاتے تو اس سے ایک نہایت عمیق سچائی عیاں ہوتی ہے - میں اب ایک دوسری آیت درج کرتا ہوں جس میں میرے خیال میں مثال اور استعاروں کے لباس میں بہت بڑی محکم سچائیوں کا اظہار کیا گیا ہے - لیکن اگر اس کا لفظی ترجمہ کیا جاتے تو اس کے معنی محدود اور معمولی ہو جاتے ہیں - وہ آیت یہ ہے کہ :

" انزل من السماء ماءً فسالت اودیة بقدرھا فاحتمل السیل زبداً رابیاً و مما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة او متاع زبد مثله کذالک یضرب الله الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاءً و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض - کذالک یضرب الله الامثال -

اس آیت کا لفظی ترجمہ یوں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل کیا - پھر اس سے اپنی بساط کے مطابق وادیاں بہ نکلیں تو سیلاب پھیلا ہوا جھاگ بہا لے گئی - اور جب لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیور یا سامان بنانے کے لیے کوئی دھات آگ میں پگھلاتے ہیں تو اس سے بھی ایسا ہی جھاگ اُٹھتا ہے - اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے کہ جھاگ تو سوکھ کر زایل ہو جاتا ہے - مگر جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے - اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے -

اس آیت میں دو مظاہر بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق موسم سے اور دوسرے کا تعلق دھاتوں کے صاف کرنے اور زیور بنانے سے ہے - اگر ہم اس آیت کے صرف لفظی معنوں پہ قناعت کریں تو یہ آیت دو ایسے معمولی قسم کے واقعات بیان کرتی ہے جنھیں عام آدمی دیکھ سکتا ہے - اگر ہم اس سکول یا گروہ کی پیروی کریں جو ایک نہ ایک شکل میں تاریخ اسلام میں ہر زمانے میں رہا ہے اور جس کے خیال میں قرآن مجید تمام علوم پر جن میں سائنس بھی شامل ہے، حاوی ہے، یا کم از کم ان کا بیان اس میں موجود ہے تو ہم اپنی مرضی کے مطابق اس آیت کے مطالب کو کھینچ تان کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں قرآن مجید نے موسمیات اور خام دھاتوں کو آلائش سے صاف کرنے کے فن کی بنیادیں رکھ دی ہیں - اور پھر ہم ان بنیادوں پہ ہر زمانے میں دریافت شدہ علم کی عمارت قرآن مجید کے نام پر کھڑی کر سکتے ہیں لیکن یہ کوشش اس مقصد کو پورا کرنے میں زیادہ مفید ثابت نہ ہوگی جو وحی الٰہی کی حقیقی غرض و غایت ہے - اس کے علاوہ ہم پہ یہ الزام بھی عائد ہو سکتا ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ایسے مطالب اس آیت کے معنی میں داخل کر دیے ہیں جو فی الحقیقت وہاں موجود نہیں اور یہ کہ جو باتیں ہمیں بہت پہلے پشت ہا پشت سے معلوم ہیں وہ اس آیت کے محدود لفظی معنوں سے کہیں زیادہ ہیں - مزید برآں ہر زمانے میں نئے انکشافات کے ساتھ ہمیں اس آیت کے معنی بدلنا پڑیں گے - البتہ جو زاویۂ نظر میں نے پیش کیا ہے اگر ہم اس کو اختیار کرتے ہوئے اس آیت کی تمثیلی تاویل کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں ایسے حقایق مضمر ہیں جن کا تعلق قوموں کی تاریخ کے ایک خاص مرحلے سے ہے - یہ مرحلہ وہ ہے جب کسی قوم کی تاریخ میں کوئی زبردست انقلاب آنے والا ہوتا ہے خواہ وہ انقلاب خدا کے کسی برگزیدہ بندے کی قیادت سے ہو جسے اس آیت میں آسمان سے بارش کے نزول سے تشبیہ دی گئی ہے یا وہ انقلاب کسی قوم کی اندرونی کشمکشوں یا بیرونی خطروں کی وجہ سے ہو، جسے اس آیت میں دھات کے پگھلنے سے تشبیہ دی گئی ہے - اس آیت کی رُو سے ایسے دونوں موقعوں پہ وہ قوم دو گروہوں میں بٹ جاتی ہے جن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک کی مثال تو پانی کے جھاگ یا دھات کے میل کی ہوتی ہے جو باوجود اپنے ظاہری حجم کے علیحدہ کر کے پھینک یا ختم کر دی جاتی ہے اور دوسرا گروہ اس صاف پانی یا دھات کی طرح ہوتا ہے جس سے مفید کام لیا جاتا ہے۔ یہ مفید کام بھی تمثیلاً دو طرح کا بیان کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ وادیوں کو ان کی بساط کے مطابق سیراب کرتا ہے جس سے زندگی نشوونما پاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے زیورات اور اوزار وغیرہ بنائے جاتے ہیں، جن سے زندگی زیادہ خوب صورت اور سود مند بنتی ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا میں صرف ان اصولوں یا ارادوں کو طولِ حیات ملتی ہے جو بنی نوع انسان کے لیے مفید ثابت ہوں اور جو خیالات یا ارادے بنی نوع انسان کے لیے مضر ثابت ہوں دیرپا نہیں ہوتے بلکہ جلد ختم یا فنا ہو جاتے ہیں۔ اس آیت کے آخر میں پھر اس بات کی تکرار ہے کہ یہ حقائق مثالوں کے ذریعے بیان کیے جا رہے ہیں۔ اس آیت کی رو سے جھوٹے تصوّرات اور مضر عقائد کو اس دنیا میں پائے ثبات نہیں اور جب کوئی قوم دورِ ابتلا سے گزرتی ہے یا جب انھیں سچائی اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کرنا پڑتا ہے تو صرف وہ لوگ جو خالص دھات کی طرح سچی خوبیوں کے مالک ہیں کامیاب ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ جو ظاہری نمود و نمائش رکھتے ہیں وہ جھاگ کی طرح بہا دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں سے جو امتحان میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں یا جو مشکلات پہ قابو پا لیتے ہیں ان سے زندگی کو بھرپور اور خوب صورت بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر ہم تاریخ اقوام پر تھوڑی سی بھی نظر ڈالیں اور غور و فکر کریں تو ہمیں اس آیت کے وسیع اور عمیق معنی کی کئی مثالیں ملیں گی بشرطیکہ لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے ہم اس کی تمثیلی تاویل کریں۔

جو کچھ مَیں نے اُوپر عرض کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن شریف کے مطالب کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسے اس نقطۂ نگاہ سے پڑھیں کہ اس کا پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مومنین کے دلوں میں اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کی داغ بیل ڈالے اور ان کو اعلیٰ اوصاف دے کر ایسے دیانتدار، بہادر، سچے اور نیک شہری بنانے میں ان کی رہنمائی کرے جو انکساری کے ساتھ اپنے کارناموں پر بجا طور پر فخر کر سکیں۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ جو عبادات قرآن مجید نے مقرر کی ہیں وہ بذاتِ خود نصب العین نہیں بلکہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں مظاہرِ فطرت کا ذکر ہے، خواہ ان کا تعلق علم الابدان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہو یا علم الاشیا سے، ان آیات کا یہ مقصد نہیں کہ اس سے ان علوم سے متعلقہ سائنس کا سبق پڑھایا جائے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ ایسی مثالیں اور تشبیہیں پیش کی جائیں جن سے بنیادی اخلاقی اصولوں کی وضاحت ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے قرآن مجید نے زمین، اجرام فلکی، پیدائش انسان وغیرہ کے متعلق ان خیالات کو اپنا لیا جو نزولِ قرآن کے وقت عام طور پر رائج اور مسلّم تھے۔ کیونکہ اگر کوئی اور خیالات اختیار کیے جاتے تو ایک نئی بحث اٹھانے سے حقیقی مقصد فوت ہو جاتا اور یہ طریقہ مذہب کے لیے بجائے سُود مند ہونے کے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا۔ چونکہ قرآن کا اصلی مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور رحمت اور اس کے قوانین کے مطابق شریفانہ زندگی بسر کرنے کی ضرورت دلنشین ہو جائے تو اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے عام اور مروج تصورات کو انہی بنیادی حقایق اور اصولوں کی تشریح کے لیے تمثیلی اور تشبیہی طور پر استعمال کیا۔ اس لیے حقیقی توجہ کے لایق یہ بنیادی حقایق اور اصول ہیں نہ کہ وہ تمثیلات اور تشبیہیں جو ان کی تشریح کے لیے استعمال کی گئی ہیں[۵]۔

اس تمہید کے بعد میں اس ابتدائی نکتہ کی طرف رجوع کرتا ہوں جس سے اس مضمون کا آغاز ہوا یعنی خلقِ آدم جسے میرے سوال کنندہ نے اس تضاد کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا تھا جو موجودہ سائنس کے نظریوں اور عام طور پر مسلمہ عقاید کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں خلق آدم کے بیان کو ایک تمثیل کے طور پر سمجھنا چاہیے۔ قرآن شریف میں یہ تمثیل مختلف مقامات پر قدرے مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے جن کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ کچھ بنیادی سچائیوں کا اظہار کیا جائے نہ یہ کہ ان سے حیاتیات یا بشریت کے سبق پڑھائے جائیں۔ جن بنیادی حقایق کا اس تمثیل کی مدد سے اظہار کیا گیا ہے وہ مفصلہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ سب موجودات کا خالق ہے اور اس کی قدرتِ خلق ایسی ہے کہ وہ ایک بے جان اور بے حس مادّے سے ذی حس اور ذی عقل جاندار پیدا یا مرتب کر سکتا ہے یہی مطالب "نفخت فیہ من روحی" کے جملے کا ہے جس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے

۵؎ ہمارے نقطۂ نگاہ سے قرآن حکیم نے گو اس دور کے خیالات و افکار میں معنویت اور سبق آموزی کی مصلحتوں کو اُجاگر کیا ہے تاہم اس میں اس نوع کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں جو کسی طرح بھی سائنسی تضاد کے حامل نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ میں نے اس میں اپنی روح پھونکی - کیونکہ خدائے تعالیٰ کی روح تمام عقل و شعور کا سرچشمہ ہے جو "صلصالٍ من حماٍ مسنون" یعنی سوکھ کر بجنے والے گارے میں حلول کر کے اس کو ایک ذی شعور ہستی بنا دیتی ہے -

۲- جس ہستی کو اشیا کا علم حاصل ہو جائے یا عطا کیا جائے اس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کو ملائکہ پر بھی فوقیت دی جاتی ہے اور ملائکہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سامنے اپنا سر سجدہ میں خم کریں - یہ شاندار حقیقت ان آیات میں بیان کی گئی ہے کہ :

"علم آدم الاسماءَ کلها ثم عرضهم علی الملائکة"

"واذ قلنا للملٰئکة اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس"

ان آیات کا ترجمہ یوں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیا کے نام سکھائے - پھر ان کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا"

۳- دوسری اعلیٰ صفات کے بغیر صرف پیدائشی اصل نسل پر غرور جائز نہیں - ابلیس کو اس بات پر غرور اور تکبّر تھا کہ اس کی اصل آدم کی اصل سے اعلیٰ ہے - اس بنا پر اس نے خدا تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے نتیجے میں وہ ذلیل کیا گیا - اس مطلب کو مدِنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل آیات کے معنوں میں غور کریں :

"قال انا خیر منه - خلقتنی من نارٍ وخلقته من طین"

جس کا ترجمہ یوں ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس (آدم) سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے -

"قال فاهبط منها - فما لك ان تتكبر فيها فاخرج انك من الصاغرين"

جس کا ترجمہ یوں ہے کہ ، اللہ تعالیٰ نے کہا تو یہاں سے نیچے چلا جا - تیرے لیے یہاں تکبّر دکھانا جائز نہیں - اس لیے تو یہاں سے چلا جا - اور تیرا شمار ان میں ہوگا جو ذلیل کیے گئے -

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گو عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جس آدم کا ان آیات میں ذکر ہے وہ ایک مخصوص ہستی تھی، لیکن سورہ اعراف کی ایک آیت اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آدم سے مراد بنی نوع انسان ہے وہ آیت یہ ہے :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم"

جس کا ترجمہ یوں ہے کہ: ہم نے تم سب (بنی نوع انسان) کو پیدا کیا۔ پھر ہم نے تم سب کی تشکیل کی اور پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔[۵]

۴۔ انسان کی ذہنی نشوونما میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اسے چند ایسے اعمال سے احتراز کرنا پڑتا ہے جو اس کی روحانی ترقی میں حارج ہو سکتے ہیں۔ یہ اعمال وہ ہیں جو اسے ابدی قوت اور دائمی عیش و عشرت کا جھوٹا فریب دیتے ہیں اور شیطان کے ورغلانے سے وہ صحیح احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ پشیمانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں مفصلہ ذیل آیات پر غور کیجیے:۔

(الف) "لا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین"

(ب) "فوسوس الیہ الشیطٰن قال یاٰدم ھل ادلک علی شجرۃ الخلد وملک لا یبلٰی"

(ج) "وعصٰی اٰدم ربہ فغوٰی"

جن کا ترجمہ یوں ہے:

۱۔ اس درخت کے قریب مت آنا ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا (جو حد سے بڑھ گئے)

۲۔ لیکن شیطان نے اس کے دل میں یہ کہکر وسواس ڈالا کہ اے آدم میں تمھیں ابدی درخت کا پتہ بتلاؤں جس کا پھل کھانے کا اثر ہمیشہ رہتا ہے۔

۳۔ تو آدم نے اپنے خدا کی نافرمانی کی اور صحیح راستے سے بھٹک گیا۔

اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ برے اعمال سے بچ کر صحیح راستے پر چلنے کی موعظت ایسی ہے جس کا تعلق

---

[۵] یہ مسئلہ اس وقت تک متنازعہ فیہ ہے کہ انسانی تخلیق حیوانی ارتقا کے تسلسل کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی ہے یا ارتقا کا نقطۂ آغاز بہرحال الگ نوع ہے جو اپنے مضمرات فکری کے اعتبار سے بہرحال انسانیت کے دائرۂ اطلاق میں داخل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارتقا اس دور کی مسلمہ حقیقت ہے مگر ارتقا کے نقطۂ اول کے بارے میں اب تک یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ (ادارہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف زمانۂ قدیم کے ایک واقعے سے ہے تو ہمارا یہ خیال درست نہ ہوگا - یہ موعظت ایسی ہے، جو بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ درکار ہے - اور ان آیات کو اس تشریح کی روشنی میں سمجھنا چاہیے - اس ضمن میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس ہستی نے آدم کے آگے اپنی پیدائش کی برتری کی بنا پر سجدہ کرنے سے انکار کیا اس کو قرآن میں ابلیس کہا گیا ہے لیکن وہ جو انسان کے دل میں شک اور وسواس ڈال کر اس کے اخلاقی اقدار کو دھندلا کر دیتا ہے اسے شیطان کا نام دیا گیا ہے - اس بارے میں ایک حدیث کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا جس میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان آدمی کے خون میں دوڑتا ہے، یعنی اس کی کوئی بیرونی ہستی نہیں -

مندرجہ بالا سطور سے میرا مدعا یہ ہے کہ اگر آدم کی پیدائش اور ہبوط کی تمثیل کی ہم اس طرح تاویل کریں جیسا کہ میں نے اوپر پیش کی ہے تو قرآنی بیان اور نظریہ ارتقائے حیات میں کوئی تضاد نہیں رہتا اس لیے کہ قرآنی بیان کا سارا زور حیاتیات سے ہٹ کر اخلاقیات پر آتا ہے - نہ صرف یہ بلکہ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس تمثیل سے جو اخلاقی سبق قرآن مجید ہمیں سکھانے کی کوشش کرتا ہے ان کا تعلق ماضی بعید سے نہیں جن کی صرف تاریخی اہمیت رہ جاتی ہے بلکہ ان میں ایسے دائمی اصولوں کا ذکر ہے جن کا تعلق زمین پر ہماری روزمرّہ کی زندگی سے ہے - اس تاویل سے ہمیں یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہم ایسے مافوق الفطرت واقعات پر اصرار نہ کریں گے جنھیں وہ لوگ جو عقاید کو عقل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں تسلیم کرنے پر تیار نہیں اور جن کے لیے اس دور لاہے پر اس کے سوائے کوئی چارہ نہ ہوگا کہ یا تو وہ ان باتوں کو مسترد کر دیں یا کورانہ طور پر مان لیں - اگر میری گزارش کے مطابق قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو میرا خیال ہے کہ اور ایسے بیانات کی بھی جن کے لفظی معنوں کا سائنس کی موجودہ تحقیقات سے تضاد نظر آتا ہے اس طرح تاویل ہو سکتی ہے کہ ان تمثیلات اور تشبیہوں میں جو سچائیاں اور حقایق مضمر ہیں وہ یوں عیاں کی جائیں کہ لوگوں کے لیے فائدہ بخش ثابت ہوں - اور اس طرح قرآن مجید کی اصلی غرض و غایت یعنی انسان کی اخلاقی اصلاح بڑی حد تک پوری ہو سکتی ہے -

---

© rasailojaraid.com